

◉ ڈاکٹر حسین احمد خان

ڈائریکٹر، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری، جی سی یونیورسٹی، لاہور

◉◉ سید عدیل اعجاز

ایم فل اسکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

جذبات اور عمارتیں: لکھنؤ، دہلی اور لاہور (انیسویں اور بیسویں صدی کے اردو ادب میں)

Abstract:

Our built environment (man-made surroundings such as buildings, muhalla, cities, gardens, etc.) has a power to invoke various types of emotions among human beings. These emotions could be of happiness, sorrow, fear, anger, surprise and joy. In nineteenth and twentieth century Urdu literature, writers associate nostalgic feelings with the built environment in the subcontinent. These feelings provide us with insights into the contemporary culture and human emotions due to the changing political and social realities. By focusing on three cultural centres of the subcontinent, Lucknow, Delhi and Lahore, this article proposes that nineteenth and twentieth century Urdu literature is an important tool to explain the power of buildings to invoke nostalgic feelings among humans.

Keywords:

Emotions, Built-Environment, Urdu Literature, Lucknow, Delhi, Lahore

جارج بٹالے، مورخ، فلسفی اور ادبی نقاد، کے مطابق فنِ تعمیر بہت حد تک معاشرے کی روح کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے^(۱)۔ اس میں معاشرے کا فنونِ لطیفہ سے متعلق نازک خیالات کا اظہار بھی ہو رہا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی تاریخ بھی اجاگر ہو رہی ہوتی ہے کہ اس نے کس قدر تمدن کی منازل طے کر رکھی ہیں۔ بوڈس بیان کرتے ہیں کہ فنِ تعمیر

خاص قسم کے احساسات اجاگر کرتے ہیں۔ یہ احساسات خوشی، خوف یا تحیر سے عبارت ہوتے ہیں اور انھی میں ملبوس ہوتے ہیں^(۲)۔ وہ اس ذیل میں ہولو کا سٹ ٹاور^(۳) کی مثال پیش کرتے ہیں جس میں جا کر انسانوں کے خیالات پر اضطراب، جارحیت اور خوف کے بادل چھا جاتے ہیں^(۴)۔ اس نکتے سے یہ پہلو عیاں ہوتا ہے کہ فنِ تعمیر نہ صرف جذبات کو ابھارتے ہیں بلکہ تاریخی واقعہ سے بالواسطہ متعارف بھی کراتے ہیں۔ تاریخی عمارات، قلعہ جات، حویلیاں، محل، سرا، سرائے اور دیوڑھیاں ہر ایک کے جذبات کی وابستگی کا طریق مختلف ہوتا ہے^(۵)۔ اگر ہم تاریخی عمارت جیسا کہ قلعہ میں کھڑے ہوں گے تو وہاں کی قد آدم دیواروں، منقش ستونوں اور پچی کاری سے مزین چھتوں اور ایوانوں کو دیکھ کر تحیر اور خوشی کے جذبات ابھر رہے ہوں گے۔ اگر ہم کسی محلِ سرا یا دیوڑھی میں ہوں گے تو وہاں ہمیں عام لوگ چلتے پھرتے محسوس ہوں گے جیسا کہ جب بھی غالب کے بکی ماراں کے محلے، پرانی دلی میں ایک قدیم محلہ، کا ذکر اردو ادب میں ہوتا ہے تو وہاں ہم عام لوگوں کو پاتے ہیں۔ حمید احمد خان نے ”مرقعِ غالب“ میں اس کا نقشہ کچھ اسی طرح کھینچا ہے۔ ریک وز، جو کہ سماجی علوم کے ماہر اور کلچرل تھیوری دان ہیں جذبات کا جگہوں کے ساتھ تعلق بیان کرتے ہیں اور اس پہلو کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ فنِ تعمیر سے جڑے ہوئے جذبات کس طرح عمل میں آتے ہیں^(۶)۔ فنِ تعمیر جہاں معاشرے کی روح کی آئینہ داری کرتے ہیں وہیں یہ طاقی ڈھانچوں کی بھی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں اہرام مصر ان طاقی ڈھانچوں کی واضح مثال ہیں۔ بوڈس کے مطابق فنِ تعمیر ”جذباتی سلطنت“ ہیں جو الگ زمان و مکان کے ساتھ الگ ماحول بھی رکھتے ہیں۔ معاشرہ اسی ماحول میں تعمیر ہوتا ہے^(۷)۔ مارگریٹ، کلچرل مورخ، اپنی کتاب ”مون سون اور جذبات“ میں بیان کرتی ہیں کہ بعض اوقات فنِ تعمیر کے پیچھے جذبات کا رفرما ہوتے ہیں۔ یہ جذبات ہی شاہی عہد میں تعمیرات کا باعث بنتے رہے ہیں^(۸)۔ مغلیہ عہد، بالخصوص عہدِ شاہ جہاں میں ایسی تعمیرات کا مشاہدہ اب تک کیا جاسکتا ہے جیسا کہ تاج محل، شاہ جہاں آباد کا شاہی قلعہ اور محلے جن کے پیچھے جذبات زیادہ حد تک کا رفرما تھے ان کی شدت کو اب تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر اہرام مصر کو دیکھا جائے جن کا مقصد شاید جذباتی طور پر بھی اپنا شکوہ قائم کرنا تھا، انہیں دیکھ کر انسان حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فنِ تعمیر میں ہمیں مختلف فنونِ لطیفہ کا اظہار نظر آتا ہے جس کو اردو ادب میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادب ہمیں انسانی سماجی زندگی میں تجربات اور جذبات کے وجود میں آنے کے متعلق بصیرت فراہم کرتا ہے۔ بقول ہوگن، ادب ہمیں واضح طور پر خوشی، غم، خوف اور ہمدردی کے جذبات کی تخلیق کے بارے میں بتاتا ہے اور تمدن کو سمجھنے کا ایک نیازاویہ دیتا ہے^(۹)۔ اس کے برعکس جذبات ہمیں ادب کو سمجھنے اور اس ادیب کے فن پارے کو سمجھنے محسوس کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ جیسا کہ اشرف صہجی، ادیب، اپنی تحاریر کے ذریعے نہ صرف دلی کی معاشرت کو سمجھاتے ہیں بلکہ جذباتی طور پر محسوس بھی کراتے ہیں اور قاری خود کو داستانوں کی ان محافل میں بیٹھا ہوا پاتا ہے، دلی کی سیر کرتا محسوس کرتا ہے اور خود کو اس تمدن کا پروردہ پاتا ہے۔

جذبات کی تاریخ ماضی کے ایک نئے پہلو سے روشناس کراتی ہے۔ مقالہ تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں لکھنؤ کے نمائندہ ادباء و شعراء کے فن پاروں میں لکھنؤ میں تاریخی فنِ تعمیر کو بیان کرنا ہے جب کہ دوسرا اور تیسرا حصہ دلی اور لاہور کی فنِ تعمیر کا اردو ادب میں ذکر عیاں کرنا ہے۔

عمارتیں، اردو ادب اور لکھنؤ:

لکھنؤ، بھارت میں اتر پردیش کا دار الحکومت، رام کے بھائی کشمن کے نام پر وجود میں آیا ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں سے رام چندر جی، ہندو اساطیر میں ایک دیو مالائی کردار کا نمبر اٹھا تھا۔ جہاں ان کا خاندان حکمران تھا۔ اسی اودھ کے میدان میں رام چندر کی ہنسی (بانسری) سے سُراٹھا کرتے تھے اور رام لیلا کے مذہبی نائک کھیلے جاتے تھے (۱۰)۔ لکھنؤ کی تہذیب اور تاریخ کہنے کو تو بہت پرانی ہے لیکن عہد جدید میں اس کے تمدن کو ایک نئی منزلت نوا بین اودھ، نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، دی، اس معاشرت کی سرپرستی کی اور اس شہر کو جنوبی ایشیاء میں تہذیب کا مرکز بنایا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد لکھنؤ کی تاریخ ایک نئے دور، تہذیب سے بھرپور، میں داخل ہوئی۔ اس سے پہلے یہ لکھنؤ کی نام سے مشہور تھا جو مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ، اودھ، تھا (۱۱) بقول نیر مسعود اودھ کی تہذیب لکھنؤ کی تہذیب ہی تھی۔ اسی نے لکھنؤ کی ۱۸۵۷ء سے بعد میں پرورش پانے والی تہذیب کو بنیاد فراہم کی تھی (۱۲)۔ دبستان لکھنؤ میں لکھنؤ کی تہذیب کو مشرقی تمدن کا آخری چراغ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا مقصود اردو ادب میں اس کے فن تعمیر اور تاریخ کا تعین ہے جو کہ جنگ آزادی ہند کے بعد عمل میں آتی ہے۔ لکھنؤ کی تمدنی تاریخ ہمیں اردو ادب میں جا بہ جانظر آتی ہے جیسا کہ عبدالحلیم شرر، نامور ادیب اور تاریخی ناول نگار، ”گذشتہ لکھنؤ“ میں نہایت شرح و بسط سے بیان کرتے ہیں (۱۳)۔ لکھنؤ میں تمدن کی یہ روایت، بالخصوص ادبی و معاشرتی تمدن ۱۸۵۷ء میں دہلی کے اجڑنے کے بعد پروان چڑھتی ہے جب اہل علم و اہل حرفہ پناہ اور نان و نفقہ کی تلاش میں دربار لکھنؤ سے جڑتے ہیں۔ اس کے محلوں کو آباد کرتے ہیں۔ لکھنؤ کا یہ تمدن واجد علی شاہ (۱۸۲۲ء-۱۸۸۷ء) نوابین اودھ کے آخری نواب، جن کے عہد میں لکھنؤ تہذیب اپنی شباب کو پہنچی اور انگریزوں کے ہاتھوں زبردستی ۱۸۵۶ء میں معزول کر دیے گئے، پر آکر تمام ہو جاتا ہے۔ یہ اہل علم ہی اس کی تہذیب کے بنیادی عوامل تھے۔ اردو ادب میں اودھ اور لکھنؤ میں مکانات اور تاریخی عمارات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔ عبدلروف عشرت لکھنؤی (۱۸۶۸ء-۱۹۴۰ء) اردو زبان کے شاعر اور ادیب، ”لکھنؤ کا عہد شاہی“، میں فن تعمیر اور تاریخی عمارات کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

”قدیم مکان نیل کے کڑاے میں تھا۔ اس وقت کے لکھنؤ کا کیا پوچھنا، شہر شک جنت بنا ہوا تھا لکھنؤ میں کہیں سڑک کا نام نہیں، دو طرفہ سربہ فلک عمارتیں، عالی شان مکانات، پتلی پتلی گلیوں میں دو طرفہ دکانیں، مینا بازار سے چینی بازار تک دکانوں میں ہر طرح کے تاجر پیشہ۔ قیصر باغ پر سنہریکس چڑھائے جاتے تھے اسی طرح اور لکھنؤ کے شاہی زمانہ دیکھنے والے بڑھے قدیم طرز معاشرت کا ذکر کرتے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔“ (۱۴)

آگے جا کر عشرت لکھنؤی لکھنؤ کی بارہ دریوں، جو نواب شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچیں، کا احوال بیان کرتے ہیں کہ کس طرح لوگ، جو اس عہد میں زندہ تھے اور شاہی دربار سے وابستہ تھے، ان کے ساتھ جذباتی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ عشرت لکھنؤی ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور کے بعد پیدا ہوئے جب لکھنؤ کا چین ایک عشرہ قبل ہی اجڑا تھا اور آپ کے اجداد نواب شجاع الدولہ کے دربار میں قلعہ دار تھے۔ آپ لکھنؤ اور نوابین کے دل ربا

(دامن دل کو کھینچنے والے) قصے سن کر جوان ہوئے جس نے آپ کے اندر لکھنؤ کے گلی کوچوں سے محبت کو پروان چڑھایا۔ اس محبت کی نمایاں جھلک مندرجہ بالا سطور میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ مکانات وہی تھے جہاں آپ کے اجداد نے وقت گزارا تھا۔ آبائی جگہوں سے محبت ویسے بھی ایک فطری عمل ہے۔ مندرجہ ذیل سطور سے اپنی شے کے کھوجانے پر غم کے جذبات ہی تو ہیں۔ اس لیے جب بھی اُن کا گزر ان جگہوں کے قریب سے ہوتا ہے تو وہ خود کو اس سے جڑا ہوا محسوس کرتے۔ فن تعمیر درحقیقت جذباتی پناہ گاہوں کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ عمارات جو کبھی آباد تھیں بعد میں اردو ادب میں استعاروں کے روپ میں ڈھلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء-۱۹۰۳ء) جنہوں نے ”اودھ اخبار“ میں مضامین کے ذریعے شہرت پائی، نامور کلاسیکی ادیب، شاعر اور لکھنؤی تمدن کے مفسر، ”فسانہ آزاد“ میں لکھنؤ سے تعلق بیان کرتے ہیں:

”اب تو گول دروازے صاف شفاف میدان ہیں اور ادھر ادھر محلے ویران اجڑے ہوئے
مکانات گرے پڑے ہیں۔ مگر ہاں صدر کی طرف گلزار ہے۔ مکانات بھی عمدہ اور پختہ ہیں۔
عمارات عالی شان، بنگلے صاف شفاف اور باغ اس کثرت سے ہیں کہ اس سرے سے اس سرے
باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔“ (۱۵)

”فسانہ آزاد“ میں سرشار نے اس وقت کے لکھنؤ کے تمدن اور اس کے اجڑتے ہوئے تمدن کو مقید کیا ہے۔ کہ گرے پڑے مکانات اور ویران محلے ویرانی کے باوجود بھی توجہ کو طالب بنے رہے تھے۔ اس میں ہمیں جگہ جگہ جن باغات، قصر باغ، شالامار باغ، فیض آباد اور کوٹھیوں کا ذکر سننے کہ ملتا ہے یہ شاہی دور کی تعمیرات تھیں جنہیں بعد میں مختلف ادبا جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے ”چاندنی بیگم“، ”آگ کا دریا“ اور شوکت صدیقی نے ”چہار دیواری“ برتا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر احسن فاروقی نے ”شام اودھ“ میں ان عمارات کو کرداروں کی نشت و برخاست کے ساتھ خوب گوندھا ہے۔ یہ جذبات تہذیب کے کھوجانے پر غم کے جذبات ہیں اور دھیمے لہجے میں اس کی بازیافت کی حسرت ہے۔ یہی جذبات ادباء کو ناسٹیلجیا میں مبتلا کرتے ہیں اور یہی صورت ہمیں علامہ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ قاضی عبدالستار (۱۹۳۳ء-۲۰۱۸ء)، تاریخی ناول نگار، ”شب گزیدہ“ میں ان عمارات کا احوال کچھ یوں ہیں:

”اس کے برابر ہی خزانے کی عمارت تھی جس پر چوبیس گھنٹے بندوبست کا پہرہ رہتا تھا۔ روش پر کوئی سو
گزر چلنے کے بعد آدمی بھراونچی کرسی پر بیٹھی وہ مغرور عمارت ملتی تھی جو شیش محل کہلاتی تھی اور دیوان
خانے کا کام انجام دیتی تھی روش شیش محل کا چکر کاٹ کر محل سرا کے اونچے کام وار ڈوب جاتی تھی۔
شیش محل کے دلان میں چھت پر بے داغ چاندنی بچھی تھی۔“ (۱۶)

یہ تاریخی عمارت اور ان کے فن تعمیر کے نقوش ادباء کے شعور میں اس لیے محفوظ تھے کیونکہ وہ کسی نہ کسی طور خود کہ اس تہذیب سے جڑا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اسی واسطے ان کے کردار ان محل سراؤں، قلعوں، شیش قلعوں اور روشوں میں جذباتی پناہ تلاش کرتے ہیں۔ خود اس سے جڑا ہوا پاتے ہیں۔ گمشدہ تمدن کو محبت کے چراغ اور جذبات کے سائے میں تلاش کرتے ہیں۔ فنون لطیفہ میں ایسی عمارات کا بیان کیا جانا ایک جذباتی وابستگی ہے جو بسا اوقات انسان کہ مغموم و متالم کیے دیتی ہے۔

اردو ادب کی دوسری اصناف جیسا کہ یادداشتوں پر مبنی مضامین میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ اس ذیل میں مرزا جعفر حسین، ادیب، مضمون نگار، لکھنو پر موجودہ مضامین، یادداشتیں اور ان پر مبنی کتاب، ”لکھنو کی آخری بہار“ میں ان عمارات اور فن تعمیر کے بارے میں بیان کرتے ہیں تو ان کی یاد سے ان کے دل پر کٹا چل جاتی ہے جس کا ذکر وہ بارہا ان مضامین میں کرتے ہیں:

”لکھنو میں بے شمار محلے، محل اور محل سرانیں تھیں۔ یہ عمارات بلند و بالا، وسیع و عریض اور بڑے شان و شکوہ کی مالک ہوتی تھیں۔ امیروں کے محل نہایت مجلا، مصفا، مختلف رنگوں سے مزین اور ان کی ساری شان و شوکت و فریب و جاذب نظر ہوتی تھی۔“ (۱۷)

مرزا جعفر کے یہاں تخیل اور گم کے جذبات کا اظہار ہے کہ کس طرح ایک تہذیب کے اجڑ جانے سے لکھنو کا تعمیری کلچر انتزاع کا شکار ہوتا چلا گیا۔ میرامن جو خود کو دلی کار وڑا قرار دیتے تھے اسی کے مصداق مرزا جعفر حسین لکھنو کی تہذیب گذشتہ کے نمائندے اور پروردہ نظر آتے ہیں جس کا اظہار ان کی یادداشتوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نیر مسعود (۱۹۳۲ء-۲۰۰۷ء)، نامور ادیب، محقق، استاد اور مسعود حسن رضوی ادیب کے بیٹے، بھی لکھنوی تہذیب کے شارح اور مفسر تھے۔ ان کے افسانوں کے کرداران ہی تاریخی عمارتوں، محلوں، منڈیوں، ڈیوڑھیوں اور محرابوں تلے نظر آتے ہیں۔ ایک چیز جو نیر مسعود کے فن پاروں میں تو اتر سے پائی جاتی ہے وہ فن تعمیر میں مچھلی کی شبیہ اور محراب ہیں۔ لکھنوی فن تعمیر میں محرابوں پر مچھلی کی بنت اس کے تمدن کی علامت تھی۔ قلعہ مچھی بھون جس کا ذکر اب تک ادب میں پڑھنے کو ملتا ہے وہ اسی طرف، مچھلی اور محراب، کی طرف اشارہ ہے۔ مرزا جعفر حسین کے بقول یہ قلعہ چھتیس محرابوں پر مشتمل تھا اور ہر محراب پر دو مچھلیاں کندہ تھیں جس بنا پر اس کا نام ”مچھی باون“ رکھا گیا جو بعد میں ”مچھی بھون“ بن گیا۔ یہ قلعہ اودھ اور لکھنو کے احوال پارینہ کی سرگزشت ہے، اس کے تمدن کا استعارہ ہے جس کو نیر مسعود نے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔

نیر مسعود کا افسانہ، وقفہ، اسی کے گرد گھومتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ محراب کی پیشانی پر بالکل ویسی دو مچھلیاں ابھری ہوئی ہیں جیسی میرے مکان میں استاد والے کمرے کے دروازے پر تھیں۔“ (۱۸)

ساسان پنجم نامی افسانے میں نیر مسعود کے جذبات اور حیرت سے مملو تاثرات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

”دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں میں بکھری ہوئی ان کوہ پیکرنگی عمارتوں کے بننے میں صدیاں لگ گئی تھیں اور ان کو کھنڈر ہوئے بھی صدیاں گزر گئی تھیں۔ خیال پرست سیاح ان کھنڈروں کے چوڑے دروں، اونچے زینوں اور بڑے بڑے طاقتوں کو حیرت سے دیکھتے اور زمانوں کو قصور کرتے تھے۔“ (۱۹)

اسی طرح ان افسانوں میں مرمریں نقش و نگار سے مزین ستونوں، مخروطی کلسوں، کندہ کاری اور کاشی کاری سے سچی دیواروں اور منبت کاری سے سنورے ہوئے دروازوں کا ذکر ”جرگہ“ میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ ”سلطان مظفر کا قصہ نو لیس“ میں نیر مسعود پر خوشی و غم کے ساتھ ساتھ تخیل آگس جذبات کی شبنم ٹپکی نظر آتی ہے جس میں وہ ڈھے چکے قلعوں اور تاریخی عمارات کے

واقعات کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے افسانوں میں لکھنواور اس کے فن تعمیر کو بیان کیا ہے بلکہ اس کی تاریخ پر سے کئی گمشدہ حقائق سے پردہ بھی ہٹایا ہے۔ یہ جذبات تہذیب کے گمشدگی میں غم کے جذبات ہیں۔ اس کی تلاش میں آہ و زاری ہے۔ ان کے تحریر کردہ مضامین، ”لکھنوکا عروج و زوال“، ”خنک شہر ایران“ میں جا بہ جا عمارات کا باغات کا ذکر ہے۔

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸-۱۸۹۱)؛ مشہور شاعر جو اودھ کے قریب ہی قصبے، ملیح آباد میں پیدا ہوئے، اپنی آپ بیتی، ”یادوں کی برات“ میں لکھنواس کے محلوں، امام باڑوں کو یاد کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

”لکھنو میں قیام کے دوران ان میں درج ذیل مقامات دیکھے۔ حسین آباد کی شاہی کوٹھی، اس کا کلاک ٹاور، حسین آباد کا امام باڑہ، اس کی بھول بھلیاں، آصف الدولہ کا امام باڑہ، رومی دروازہ، حضرت عباس کی درگاہ، تال کٹورے اور پھول کٹورے کی کربلائیں، شاہ مینا کا حزار، موتی محل، امین آباد، گومتی، لال باغ، سکندر باغ، وکٹوریہ باغ، بنارس منزل اور چھتر منزل۔ یہ ساری باتیں دیکھ میں نقش بد دیوارہ گیا۔ اب نہ وہ لکھنو ہے نہ لکھنوالے۔“ (۲۰)

جوش شعر میں اس قصبے کو یوں بیان کرتے ہیں:

اپنے، کبھی کے رنگ محل، جو ہم گئے
آنسو ٹپک پڑے در دیوار دیکھ کر (۲۱)

جوش ملیح آبادی کا تعلق بھی نوابی گھرانے سے تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی آپ بیتی، ”یادوں کی برات“ میں کیا ہے۔ آزادی کے دوران جب تو نگری ان سے روٹھ گئی، ابا و جداد کی مٹی سے ان کا نااط ختم ہو گیا تو اس کے فراق نے جوش کو بے حد جذباتی کیا۔ جس سے کبھی خاندان کے پر شکوہ ماضی پر مانند غالب خوب خوش ہوتے اور مسرت سے اترتے تو کبھی ان سب کے لٹ جانے پر آنسو بہاتے۔ یہ جذبات ان کے بچپن کے دور کے تمدن کے ختم ہو جانے کی دین تھے۔ عمارتیں، اردو ادب اور دہلی:

دلی، بھارت کا دار الحکومت، مسلمانوں کی آمد سے پہلے آباد شہر تھا البتہ کی اس کی رونق کو دوام مسلمانوں کی آمد کے بعد ملا۔ سلطان شمس الدین التتمش (وفات ۱۲۳۶ء) کے عہد حکمرانی میں یہ دار الخلافہ بنا جن کے دور میں مسجد قوت الاسلام (۲۲) کی سنگ بنیاد رکھا گیا جو مسلمان فن تعمیر کی ایک نمائندہ مثال بن گئی اور آہستہ آہستہ یہ شہر تہذیب کا گہوارہ بننا چلا گیا۔ دلی شہر، سلاطین دہلی کے دور میں بھی اہمیت کا حامل رہا مگر اس کے مضبوط تمدن کو نیا رخ، بالخصوص فن تعمیر کے توسط سے، شاہان مغلیہ، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں (۱۵۹۲ء-۱۶۲۶ء) کے عہد میں عطا ہوا۔ عہد شاہ جہاں میں فن تعمیر کی روایت کی بنیاد، جس کی نیو (بنیاد) بابر نے رکھی، اکبر اور جہانگیر نے پروان چڑھائی، مزید گہری ہوئیں۔ بقول عبداللہ چغتائی، فن تعمیر کے استاد اور محقق، تاج محل شاہ جہاں کے عشق کی کہانی سے بڑھ کر دل کے تمدن کی نورانی روح کا عکاس بن گیا (۲۳) دلی کی معاشرت کی صورت گری شاہان مغلیہ اور مسلمان حکمرانوں نے خوب کی ہے (۲۴)۔ اردو ادب میں اس کے تاریخی عمارتوں کا ذکر مختلف حوالوں سے ہوتا ہے۔ کبھی یہ منشی فیض، ادیب اور شاعر، کی ”بزم آخر“ میں نظر آتا ہے تو کبھی یہ عرش

تیجوری، ادیب، کی ”قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں“ میں رونما ہوتا ہے۔ علاوہ بریں دلی کی طرز تعمیر و معاشرت کی گونج محمد شفیع، صاحب طرز رومانوی ادیب، کی کتاب ”دلی کا سنبھالا“ اور ملا واحدی، ادیب، کی کتاب ”میرے زمانے کی دلی“ میں بھی سنائی دیتی ہے۔ کتاب ”داستان غدر“ میں ظہیر دہلوی دلی میں فن تعمیر اور تاریخ عمارات کے حسن کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”مزار مبارک سے سات کوس کے فاصلے پر جانب جنوب موضع مہرولی میں واقع ہے۔ یہ موضع زمانہ سلطنت راجا ہندوستان میں دار الخلافہ ہندوستان تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ راجہ پرتھی راج فرمانروائے ہندوستان اسی مقام پر اورنگ آرائے سلطنت ہوئے۔ مسلم عہد میں یہاں بت خانہ ٹوٹا اور مسجد تعمیر ہوئی۔ اس میں شک نہیں اگر یہ مسجد تعمیر ہو جاتی تو روئے زمین اس تعمیر کا نظیر نہ ہوتا۔ ایک مینار تعمیر ہو گیا اور دوسرا ہنوز ناتمام تھا۔ دور مینار کی عمارت مٹن کر کی نہایت خوش نما و مطبوع ہے اور پوشش عمارت سنگ سرخ سے ہے۔“ (۲۵)

ظہیر دہلوی نے غدر کا آنکھوں دیکھا حال اپنی کتاب ”داستان غدر“ میں تحریر کیا ہے اور اس میں ”دل کی تقریبات“ میں غدر سے پہلے کی عمارات کو حسرت و یاس سے یاد کیا ہے، لفظوں کے ذریعے اشک باری کی ہے۔ ”داستان غدر“ میں حزن اور غم کے تاثرات کا اظہار ہے۔ یہ تاثرات ہنگام دلی کی دین تھے۔ داستان غدر کی مانند دلی کے حالات و واقعات اور سماجی تمدن، سیاسی حالات اور خانقاہی نظام کی کچھ جھلکیاں کتاب ”مرقع دہلی“، نواب درگاہ قلی خان، میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ درگاہ قلی اس وقت کے دلی کے چاندنی چوک کی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

”از ہمہ چوک ہارنگین است و از ہمہ گذر ہا سراپا تزیین سیرگاہ موز و نان است و تماشا کدہ نہت طالبان۔“ (۲۶)

”تمام چوکوں سے رنگین تر ہے اور سب گزرگاہوں سے زیادہ آراستہ و مزین۔ موزوں لوگوں کی سیرگاہ اور طالبان نہت کا تماشا کدہ ہے۔“ (۲۷)

مندرجہ ذیل پیرا گراف درگاہ قلی خان کی دلی کی عمارات کی رونق پر دال ہے جس نے انھیں حد درجہ مرعوب کیا ہے۔ اس سے یہ پہلو بھی عیاں ہو رہا ہے کہ اس وقت کی دلی کتنی ہر بہار اور تمدن میں گندھی ہوئی تھی۔ دلی کی یادوں اور عمارات سے متعلق سب سے زیادہ جذباتی وابستگی ناصر نذیر فراق، صاحب طرز ادیب، ناول نگار، کے ہاں پائی جاتی ہے۔ فراق نے دلی اور اس کی خوبصورت یادوں کو اوراق پر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ”مضامین فراق“ میں لال قلعے اور اس کے قریب سے بہتی ندی کے منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

”مسجد گھاٹ سے لے کر ترپو لیے تک نہانے دھونے والوں جھومر کے جھومر اور جھلڑ کے جھلڑ دکھائی دیتے تھے۔ لال قلعے کے جھروکوں کے نیچے جو آب رواں کی لطافت تھی وہ کہتی تھی کہ میں کبھی حسن مغلیہ کے نوٹوں کی پلیٹ رہ چکی ہوں۔ مجھ میں زیب النساء اور جہاں آراء اور عالم آراء اور ممتاز محل کے سراپا کا عکس پڑا ہے۔ اس شاخ زریں کے کنارے مچھلی پکڑنے والے شست اور کٹا دریا میں ڈال کر اپنے محبوب کی تصویر میں کنارے پر غرق رہتے تھے۔ فقیر فراق، بارہ دری

میں بیٹھے اشرافی نظر سے یہ تماشے دیکھا کرتا تھا۔“ (۲۸)

دلی کے پوشیدہ ارباب کمال میں فراق کہتے ہیں:

”یہاں تک کے ۱۸۵۷ء نے مغلیہ سلطنت کے تخت کو تختِ تابوت میں بدل ڈالا۔ دلی تباہ ہو گئی
حکیم صاحب کو شاپ بھورے کا کہنا یاد آیا کہ، وہ لال قلعہ گرا دیا، وہ ڈھادیا۔ اب حاکمِ وقت نے
جاپے جا توڑ پھوڑ شروع کی اردو بازار، خاص بازار، خانم کا بازار، باقی بیگم کا کوچہ، بگوا باڑی، کاغذی
محلہ، زنگاری پردہ، نواب بیگم عالیہ کا محل، کیشو رائے ہرکارے کی حویلی اور خدا جانے کیا کیا مسمار
ہو گئے۔“ (۲۹)

اسی طرح، ناصر فراق، ”لال قلعے کی ایک جھلک“ میں بیان کرتے ہیں کہ خانم صاحبہ لال قلعے کو جب بھی یاد
کرتیں، تو سسکیاں بھرتی جاتی اور ساتھ ساتھ اس سے، اسے کی عمارات سے جڑے واقعات کو بیان کرتی جاتی تھیں۔ دلی
کو کبھی شاہ جہاں آباد تو کبھی اجڑا دیا کرتی تھیں۔ دراصل فراق کے اجداد کا تعلق شاہی قلعے سے تھا۔ آپ ہی کے بقول آپ
شاہی قلعے کی کہانیاں اور داستانیں سن کر جوان ہوئے تھے۔ جس نے ان کے اندر ان تاریخی عمارت سے نہ صرف محبت کو
پیدا کیا، بالکل اس کے کھو جانے پر مغموم بھی کیا۔ آپ کے شاہی قلعے کے کھوم جانے پر غم کے جذبات تھے جنہوں نے
فرنگیوں کے خلاف ان میں نفرت کے شعلوں کو ہوا دی۔ یہ عمل قدرت کا ودیعت کردہ ہے۔ فراق کے بعد دلی کے آشوب
اور غم و اندوہ کو سب سے زیادہ، حزن و غم میں ملفوف زبان شاہد احمد دہلوی، نامور ادیب، خاکہ نگار، نے دی ہے۔ شاہد احمد
دہلوی نے نہ صرف دلی کے اجڑاؤ اور اس سے وابستہ کہانیاں نوکِ قلم سے ٹپکائی ہیں بلکہ اس موضوع پر تحقیق بھی کی کے ”اردو
ادب میں دلی“ کو کیسے بیان کیا گیا ہے۔ بقول شاہد احمد دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، بشر الدین احمد اور راشد الخیری کے ہاں
دلی سے متعلق یادداشتوں کا خزانہ ہے (۳۰)۔ علامہ راشد الخیری، مصور غم، ناول نگار، تودلی، مغل شہزادیوں پر پڑنے والی
افتاد کا ذکر کر کے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ دلی کے اجڑے دیار انھیں شاہانِ مغلیہ کی یاد دلاتے تھے۔ ”دلی کی پیتا“ میں شاہد
احمد دہلوی دلی کو یوں یاد کرتے ہیں:

”یہ میرا وطن تھا جو مجھی کو کانٹے کو دوڑ رہا تھا۔ میرے آبائی مکان میں، جس میں ’ساقی‘ کا دفتر تھا،
ایک ہندو انپکڑ آباد تھا۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد، مترجم قرآن، کا مکان تھا۔ محمد حسین کے مکان میں سکھ
رہتے تھے۔ منشی ذکا، اللہ کی حویلی میں شرناتھی آباد تھے۔ یہ تو میری دلی نہیں ہو سکتی اور وہ درود دیوار
جن سے بقول انشاء اللہ لطافت برتی تھی اب تسی پس سے گونجتے رہتے ہیں۔“ (۳۱)

مرا درد یست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

دگر درد کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد (۳۲)

شاہد احمد دہلوی دلی سے متعلق اپنے تمام جذبات کو اس شعر میں سمو کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے:

ان کی جانے سے یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت

نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت (۳۳)

فراق کو جیسے شاہی قلعے کا تمدن ستا تا تھا، کباب کرتا تھا اسی کے مصداق شاہد احمد دہلوی کو دلی کے کوچوں، محلوں اور گھر کے تمدن کا تحلیل ہو جانا ستا تا تھا۔ شاہد احمد دہلوی سے ان آبائی گھر پاکستان کی آزادی کے دوران تو چھوٹا ہی مگر اس سے بڑھ کر کتنی دوراں کا سامنا آپ نے پاکستان میں کیا جس نے انھیں شاندار ماضی میں جذباتی پناہ لینے پر اکسایا۔ شاہد احمد دہلوی نے لفظوں کے وسیلے سے اشک باری کی۔ یہ آنسو، یہ دکھ آپ کی تحریروں میں بالواسطہ دیکھا جاسکتا۔ اخلاق احمد دہلوی، ادیب، بھی اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب، ”یادوں کا سفر“ دلی اور اس میں گزرے شب و روز، پرانی حویلیوں سے جڑی یادوں کو میٹتے ہیں، اس یاد سے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو، افشاں کی طرح پلکوں پر چمکنے لگتے ہیں، رخساروں پر لے لگتے ہیں۔ اے۔ حمید، ادیب و ناول نگار، جب بعد از تقسیم دلی کے سفر پر گامزن ہوتے ہیں تو اجڑے دیار اور بام و در کو دیکھ کر متالم ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ”بانئیں خواجاؤں کی چوکھٹ“ میں دلی کو یوں یاد کرتے ہیں:

”کنہیا لال کپور نے اپنے مزاحیہ مضمون میں لکھا تھا کہ دلی کی ہر اینٹ کے نیچے ایک بادشاہ دفن ہے۔ میں نے دلی جی ہر اینٹ کے نیچے جھانک کر تو نہیں دیکھا لیکن ہر اینٹ اسلامی ثقافت اور مسلم کلچر کے نشان ضرور ثبت دیکھے ہیں۔ میں نے دلی سے پیار کیا ہے۔ اس کے باغوں، پرانی بارہ دریوں اور تاریخی گلی کوچوں سے پیار کیا ہے۔“ (۳۴)

آگے چل کر کہتے ہیں:

”قطب صاحب کی نیم روشن سرخ سنگ سرخ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے شہنشاہ ہمایوں کا خیال آگیا جس نے انھی سیڑھیوں سے گر کر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی تھی۔“ (۳۵)

ان تمام فن پاروں سے یہ امر مترشح ہے کہ ادباء و شعراء کس طرح جذباتی طور پر فن تعمیر کے ذریعے اپنی تاریخ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ پرانی اور تاریخی عمارات تاریخی واقعات کو بالواسطہ یاد دلانے کا موجب بھی بنتی ہیں ساتھ ہی ساتھ جذباتی پناہ گاہ کا بھی سامان مہیا کرتی ہیں۔ ناسٹیلجیا کے احساسات بھی اسی فن تعمیر کے بھروسے پرورش پاتے ہیں جو انسانوں کو اپنے ورثے سے جوڑے رکھتے ہیں۔

عمارتیں، اردو ادب اور لاہور:

لاہور، پاکستان کا شہر، ایک ثقافتی شہر تو تھا ہی مگر ادبی دنیا کے منظر نامے پر اس کا ظہور کسی حد تک ادبی جراند، ’ہمایوں‘، ’مخزن‘ کے ذریعے ہوا۔ لاہور کی تاریخ بارے میں یہ روایت تو اتر سے بیان کی جاتی ہے کہ ”لہو“ نے یہ شہر بسایا تھا جس بنا پر اس کا نام لاہور پڑ گیا (۳۶)۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے حاکم لاہور راجہ جے پال تھا (۳۷)۔ جس کے دور کے آثار شہر لاہور میں کہیں بھی نظر نہیں آتے نہ ہی اس کے پر شکوہ محلات کا ذکر ادب میں موجود ہے۔ اگر اس دور میں کوئی ادب تخلیق ہوا ہوتا تو ان محلات کا اس کا ذکر کسی نہ کسی پیرائے میں ضرور ہوتا مگر مورخین کی نگاہ باریک بین ابھی تک ان تخلیقات کو تلاش کرنے سے معذور ہے۔ بیرونی حملہ آوروں نے جب بھی ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ان کا گزر پہلے لاہور ہی سے ہوتا تھا۔ یہ ایک گزر گاہ کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ وسط ایشیاء سے مسلمانوں نے یہاں آکر قیام کرنا شروع کیا تو اصفیاء، جوان قافلوں کے ہمراہ یہاں آئے، نے اس شہر میں علم و ادب کے دیپ روشن کیے۔ مسعود سعد سلمان، شاعر،

محمودی لشکر کے ساتھ وارد لاہور ہوئے، کی شاعری کا دیوان اس امر کی توثیق کرتا ہے۔ ہمارا مقصد اردو ادب میں لاہور کی تاریخی عمارتوں کی کس طرح عکاسی کی گئی ہے کو بیان کرنا ہے۔ اردو ادب میں لاہور کے ذکر پر نظر ڈالی جائے تو اس کے گلی، کوچوں، بازاروں اور ریسٹورانوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ بالخصوص آزادی کے بعد لکھے جانے والے فن پاروں میں شہر لاہور کے چائے خانے اور ریسٹوران ہی اس کے فن تعمیر اور معاشرتی زندگی کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی واسطے ادباء کے زیادہ تر جذبات انھی سے منسلک ہیں۔ تاریخی عمارات کا ذکر جتہ جتہ اولیاء کے تذکروں اور سوانحی ادب میں مل جاتا ہے جیسا کہ میاں میر کے بارے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی حیات میں کامران کی بارہ دری، دریائے راوی کے وسط میں، باغ میا بانی، چو برجی، اور باغ انارکلی میں بیٹھا کرتے تھے۔ علاوہ بریں اس کی وقت کی عمارات کے فن تعمیر کے متعلق معلومات کہ ان عمارات کو کن معماروں نے، کتنے عرصے میں اور کن نمونوں پر استوار کیا۔ ان میں استعمال ہونے والے پتھر کون کون سے تھے اور کہاں کہاں سے منگوائے گئے تھے۔ یہ پتھر کہاں تراشے جاتے تھے۔ ان قیمتی پتھروں کی مدد سے پرچین کاری کے نمونے کہاں سے حاصل کیے گئے اور اس میں کون سا قیمتی پتھر استعمال میں لایا گیا، ایسی معلومات اس وقت میں لکھی گئی کتب، شاہ جہاں نامہ، بادشاہ نامہ، طبقات اکبری، طبقات ناصری میں تو اتار سے ملتا ہے اس کے علاوہ ماہر فن تعمیر جیسا کہ محمد عبداللہ چغتائی اور سید ہاشمی فرید آبادی، ادیب، مورخ، کی کتب میں میسر ہے جو شہر لاہور کے آثار کو اوراق میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

اردو ادب میں، اپنی یادوں کے ذریعے جنھوں نے لاہور کے گلی، محلوں اور کوچوں کو ان کے معاشرتی تمدن کے ساتھ سمیٹا ہے وہ حکیم احمد شجاع (۱۸۹۳ء-۱۹۶۹ء)، ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، ہیں۔ آپ نے آزادی سے قبل لاہور، بالخصوص بازار حکیمان، جو بھائی دروازے سے آگے شروع ہوتا ہے، کی روزمرہ کی زندگی کو بیان کیا ہے۔ جس میں ہمیں لاہور کا تھڑا کلچر بے حد خوش نمائی سے نظر آتا ہے (۳۸)۔ آزادی کے بعد اس کی معاشرت پر خط کشی ہی تو پھر گیا ہے۔ لالہ کنہیا لال کپور بھی تاریخ لاہور لکھتے ہوئے آب دیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے کے کس طرح سکھوں کے عہد میں تاریخی عمارتوں کو سنگ و خشت کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا (۳۹)۔ جہاں انسان کی نال گڑی ہو، اپنا وقت گزارا ہو، تو وہی چیزیں اور عمارتیں بربادی سے دوچار ہو جائیں یا کردی جائیں تو انسان ایسی اوا مر سے از خود جذباتی ہو جاتا ہے۔ محمد دین فوق، مورخ، مقبرہ نور جہاں کی تاریخی عمارت اور فن تعمیر سے متعلق بیان کرتے ہیں:

”۱۹۰۵ء سے پیشتر راقم الحروف نے اس مقبرہ حسرت نما کی جو حالت دیکھی ہے اس کی عبرت انگیز کیفیت سے انسان تو انسان صحرا بھی حیرت ناک ہو جاتا تھا۔ جن باتوں کا ذکر مصنف ’شاہ جہاں نامہ‘ محمد صالح کمبوہ نے اپنی تاریخ میں بڑے پر شکوہ الفاظ میں کرتا ہے وہ اب خواب و خیال نظر آتی ہیں۔ مقبرے کے زرین اور مینا کار کمرے، چارچمن، اس کی کھلی اور پر بہار روشیں، لوح مزار اور اس پر قرآنی آیات، اسمائے الہی، سنگ مرمر، سنگ ابری کے فرش اور ان کے درمیان انواع و اقسام کے پتھروں کی گروہ بندیاں، پچی کاری کے نقش، باغ اور مقبرہ کا دروازہ غرض کسی چیز کا نشان کیا، نام نہیں۔“ (۴۰)

مندرجہ بالا سطور یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ فوق کس طرح اپنی ماضی سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان سطور میں غم کے جذبات نمایاں ہیں جو ورثے کی خستہ اور زبوں حالی کی وجہ سے ہیں۔ اسی کے مصداق فوق ”بدھو کا آوہ اور مقبرہ“ کا بھی حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے ذکر کرتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ فن تعمیر، ان کی طرز تعمیر نہ صرف شہر کی خوبصورتی پر دال ہے بلکہ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ لوگ کس قدر ان سے جذباتی طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔

اے۔ حمید، ادیب، افسانوں اور یادداشتوں میں شہر لاہور کی محافل، قبوہ خانوں، ریسٹورانوں اور سڑکوں کو کچھ ایسے یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں:

”اسٹینڈرڈ، ریگل کے پہلو میں اس جگہ تھا جہاں آج ایک بینک کھلا ہے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے دیوندر ستیا رتھی سے میری ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی تھی۔ ناٹے قد کا بھاری بھر کم رام پال، ریلوے ہیڈ کوارٹر میں کلرک تھا اور مصری شاہ سے آگے رام نگر میں رہا کرتا تھا۔ وہ دانشور تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب گھوٹ کر پی گیا تھا۔ فسادات کے بعد رام نگر میں رام کا مکان دیکھنے گیا تو وہاں سوائے بجھے ہوئے انگاروں کے اور کچھ نہ تھا۔“ (۴۱)

اے۔ حمید ”پت جھڑکی نشانی“ میں فن تعمیر کو یوں بیان کرتے ہیں:

”مغل طرز کے ایک پرانے، ٹوٹی پھوٹی برجیوں والے تنگ دروازے سے ہو کر بوسیدہ کوٹھری نما دکانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا تاریک بدنما بازار، جھکے ہوئے ٹیڑھے مکانات کے بدھے چھپے ان سایوں سے گزر کر میں بازار سے سامان لینے گیا۔“ (۴۲)

اے۔ حمید نے آزادی سے قبل اور بعف میں زندگی کا بے حد حصہ لاہور شہر اور اس کے چائے خانوں، قبوہ خانوں میں گزرا تھا، جب یہی قبوہ خانوں کی تہذیب مٹ گئی تو ان کا غم آگیا ہونا فطری تھا۔ کیوں کہ انھوں جگہوں سے جہاں خوشی اور غم کے بے لچات گزرے ہوں وابستگی ایک قدرتی امر ہے۔ اسی طرح لاہور کے گلی کوچوں، ہوٹلوں پر نشست و برخاست کا ذکر ہمیں کرشن چندر، ادیب، افسانہ نگار، کے افسانے ”دو فرلانگ سڑک“، گوپال متل، صحافی، کی یادداشتوں پر مبنی کتاب ”لاہور کا جو ذکر کیا“ اور ڈاکٹر ایلیم۔ ناز، مضمون نگار، محقق، کی کتاب ”لاہور نامہ“ میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو ادب کے استاد، محقق، ادیب، اپنی خودنوشت ”یادِ عہد رفتہ“ میں لاہور وارِ دلاہور ہونے کے بعد کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

”لاہور ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا شہر تھا۔ یہاں میں نے جو تہذیبی اور ثقافتی ماحول دیکھا وہ دنیا کے کسی شہر میں نظر نہیں آیا۔“ (۴۳)

مرزا ادیب، مدیر، ناول نگار، نے بھی اسی شہر لاہور کی کے شاہی قلعے کی دیواروں پر بیٹھ کر اپنے فن پارے تخلیق کیے (۴۴)۔ واصف ناگی، صحافی، نے حال ہی میں کتاب ”وہ لاہور کہیں کھو گیا“ کے ذریعے شہر لاہور کے کھوجانے کا اظہار کیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تاریخی عمارتیں زمانے کے ہاتھوں دست برد کا شکار ہو جاتا ہے تو انسان اس میں جذباتی پناہ تلاشتا ہے۔ اس کی بازیافت چاہتا ہے۔

اردو ادب ہی پر کیا موقوف انگریزی اور روسی ادب میں بھی مختلف ادباء نے تاریخی شہروں اور فن تعمیر کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ٹالسٹائی 'وار اینڈ پیس' میں، ڈکنز 'اے ٹیل آف ٹو سسٹیز' میں اور فٹز جیرلڈ گیٹس 'بے' میں ان کا احوال بیان کرتے ہیں۔ یہ عمارتیں اور فن تعمیر کے مٹتے نقوش ان کو جذباتی کر کے رکھ دیتے ہیں بالخصوص اس وقت جب یہ یہ بتا ہی سے دو چار ہوں یا انسانوں کا ان سے ناٹھ ٹوٹ جائے۔ اردو ادبیات میں انہی کو مختلف حوالوں کے ساتھ اور ان سے وابستہ جذبات کی روشنی تلے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کن عوامل کی بنا پر یہ تاریخی عمارتیں جذباتی پناہ گاہوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔

حوالہ جات

1. Mark Hewson and Marcus Coelen, *Georges Bataille*, (London: Taylor & Francis, 2015), P.30
2. Rob Boddice, *The History of Emotions*, (Manchester: Manchester University Press, 2020), P.178
- ۳۔ ہولوکاسٹ ٹاور ”جیوش میوزیم برلن“ میں واقع ہے۔ یہ میوزیم درحقیقت یہودیوں کی جرمنی میں یادگاروں کو محفوظ کیے ہوئے ہے اور اس بات پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ ہٹلر کے دور میں ان پر کس طرح افتاد ٹوٹی اور کس طرح ان کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی۔
4. Boddice, *The History of Emotions*, P.178.
5. Giuliana Bruno, *Atlas of Emotion: Journeys in Art, Architecture, and Film* (London: Verso, 2002), P.295.
6. Andreas Reckwitz, *Affective Spaces: A Praxeological Outlook, Rethinking History*, (London: Taylor & Francis, 2012), P.241-258.
7. Boddice, *The History of Emotions*, p.181.
8. Margrit Pernau and Katherine Butler Schofield, *Monsoon Feelings: A History of Emotions in the Rain*, (New Delhi: Niyogi, 2018), P.30.
9. Patrick Colm Hogan, Bradley J. Irish, and Lalita Pandit Hogan, *The Routledge Companion to Literature and Emotion*, (London: Routledge, 2022)
10. Madhu Trivedi, *The Making of the Awadh Culture*, (Dehli: Primus Books, 2010)
- ۱۱۔ نجم الغنی خان رامپوری، تاریخ اودھ، (لکھنؤ: منشی نول کشور، جلد اول، ۱۹۱۹ء)، ص ۱۷۰
- ۱۲۔ نیر مسعود، لکھنؤ کا عروج و زوال، (کراچی: آج پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۷
13. Binti Singh, “Social Media, Cultural Activism and Place-making in Contemporary Lucknow”, *Society and Culture in South Asia*, 5, no.1, 2019, P.1-18.
14. Abdulhalim Sharar, *Guzishta Lucknow* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2006)
- ۱۵۔ عشرت لکھنوی، لکھنؤ کا عہد شاہی، (لکھنؤ: گلشن ابراہیمی پریس، ۲۰۲۰ء)، ص ۲۰
- ۱۶۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، (لاہور: آصف بک سٹال، ۲۰۲۱ء)، ص ۱۳۳
- ۱۷۔ قاضی عبدالستار، شب گزیدہ، (جہلم: جہلم بک کارز، ۲۰۲۱ء)، ص ۸-۹

- ۱۸۔ مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۴-۱۵
- ۱۹۔ نیر مسعود، مجموعہ نیر مسعود، عطر کا فور، افسانہ وقفہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۷۴
- ۲۰۔ نیر مسعود، مجموعہ نیر مسعود، عطر کا فور، افسانہ ساسان پنجم، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۱۹
- ۲۱۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۷ء)، ص ۸۶
- ۲۲۔ یادوں کی برات، ص ۱۴
- ۲۳۔ بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی، (دہلی: اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء)، ص ۵۰
- ۲۴۔ عبداللہ چغتائی، تاج محل، (لاہور: کتاب خانہ نورس، ۱۹۶۳ء)، ص ۶۹
25. Khaliq Ahmad Nizami, *Delhi in Historical Perspectives*, (Delhi: Oxford University Press, 2020)
- ۲۶۔ ظہیر دہلوی، داستان دہلوی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۲۷
- ۲۷۔ نواب درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۲۰ء)، مترجم: ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید پزدانی، ص ۲۶
- ۲۸۔ نواب درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، ص ۲۶
- ۲۹۔ ناصر نذیر فراق، مضامین۔ فراق، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۴ء)، مرتبہ: محمد سلیم الرحمن، ص ۶۱
- ۳۰۔ ناصر نذیر فراق، مضامین۔ فراق، ص ۱۲۰-۱۲۱
- ۳۱۔ شاہد احمد دہلوی، گلدرستہ شاہد، (کراچی: فضلی بک، زندہ کتابی سلسلہ۔ ۲۰۲۰ء، ۹۷)، مرتبہ: راشد اشرف، ص ۱۳۱
- ۳۲۔ شاہد احمد دہلوی، دلی کی بیپتا، (کراچی: شہزاد، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۳-۲۶
- ۳۳۔ دلی کی بیپتا، ص ۶۳
- ۳۴۔ دلی کی بیپتا، ص ۷۴
- ۳۶، ۳۵۔ اے۔ حمید، یادوں کے گلاب اور ڈربے، (کراچی: زندہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۹-۳۰، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۶۲
37. Syed Mohammad Latif, *Tareekh-e-Punjab*, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1994)
- ۳۸۔ لالہ کنہیا لال، تاریخ پنجاب، (لاہور: بک ٹالک پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۱
- ۳۹۔ حکیم احمد شجاع، لاہور کا چیلسی، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، س۔ن)، ص ۳۰
- ۴۰۔ لالہ کنہیا لال، تاریخ لاہور، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن)، ص ۷۰
- ۴۱۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۷۵
- ۴۲۔ اے۔ حمید، یادوں کے گلاب اور ڈربے، (کراچی: زندہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۹-۳۰، ۲۰۱۸ء)، ص ۴۵
- ۴۳۔ اے۔ حمید، مجموعہ اے حمید، کتاب: مٹی کی مونالیزا، افسانہ: پت جھڑکی نشانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۱۳
- ۴۴۔ عبادت بریلوی، یاد و عہد رفتہ، (لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۹۷

